معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

(عبدالحمید صدیقی)

بربادی اور کشت و خون کے وہ طوفان اور تخریب و ہلاکت کے وہ شور و شر جنہوں نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر رکھا ہے دراصل ایک عالمگیر انقلاب کا پتہ دے رہے ہیں۔ یہ اس بات کی بیّن دلیل ہیں کہ انسانیت کا قافلہ "کرب و بلا" میں گرفتار ہے اور اپنے لیے فلاح کی کوئی راہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کا اضطراب اس حقیقت کی نشان دہی کر رہا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہیں، وہ اپنے نظریات، اپنے افکار، اپنے طرزِ زندگی اور اپنے ماحول میں ایک تبدیلی اور خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا متمنی ہے، مگر اُسے اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ عین اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی محنتوں کا زیاں دیکھتا ہے، مگر سوائے خون کے آنسو بہانے کے اور کچھ کر نہیں پاتا، اُس کی نظر کے سامنے اُس کا اخلاق، اُس کی معیشت، اُس کی معاشرت، اُس کی سیاست تباہ و برباد ہو رہے ہیں مگر اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ ساری ہلاکت و بربادی کس لیے ہے اور اس سے کیونکر نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہ ہر آن تخیلات و افکار کے نئے نئے محلات تعمیر کرتا ہے اور اس توقع پر تعمیر کرتا ہے کہ ان کے سائے میں اُسے ابدی آرام و سکون حاصل ہوگا مگر چند لمحے بھی گزرنے نہیں پاتے کہ وہ خود بخود پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔

توڑ پھوڑ کا یہ عمل یُوں تو بڑے عرصہ سے جاری ہے مگر اس کی شدت میں پچھلے چند سالوں سے نہایت حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ شکست و ریخت کے اس سارے کھیل کے متعلق ایک بات جو نہایت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اور سربراہی اب تک

جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اُس کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ اُس کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر آلگا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ اُن کو اور ان کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا میں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔ اس امر کی شہادت خود اس تہذیب کے حامی پیش کر رہے ہیں۔ یہاں ہم ان بڑے بڑے مفکرین کے چند اقوال نقل کرتے ہیں، تاکہ آپ کو اس بات کا ایک معمولی اندازہ ہو سکے۔

پروفیسر آرنلڈ جے۔ ٹائن، بی: تاریخ انسانی کا ایک عظیم المرتبت عالم ہے۔ اس نے مطالعۂ تاریخ A STUDY OF HISTORY ایسی جامع تصنیف لکھ کر پوری دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کے ورلڈ ریویو (WORLD REVIEW) میں اس کا ایک مضمون "تاریخ موجودہ انسان کو متنبہ کرتی ہے" (HISTORY WARNS MODERN MAN) شائع ہوا۔ اس میں اُس نے بڑی صفائی اور تفصیل کے ساتھ اس تہذیب کی ناکامی کا ذکر کیا ہے اور پوری جرأت اور ایمانداری کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ موجودہ تہذیب انسان کو صحیح فلاح سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔

"جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤں بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ اس کا بنک اکاؤنٹ، اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں۔ یہ تعلق بڑا خطرناک ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُسے بازی مار لینی چاہیے۔ لیکن اسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر بھروسہ نہیں ہے کہ ان کے بل پر اس کی کامیابی یقینی ہو۔"

"اگر وہ علم النجوم پر اعتقاد رکھتا تو وہ نجومیوں سے التجا کرتا کہ وہ اسے اس کرب سے نجات دلائیں اور ان سے دریافت کرتا کہ کیا وہ اس معرکۂ "روح و بدن" میں کامیاب ہوگا؟ اسے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ قسمت پہلے سے کر چکی ہے۔ مگر عہدِ حاضر کا انسان اتنا توہم پرست نہیں کہ رمال پر اعتماد کرے۔ اس لیے وہ مفکرین کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ علمائے اجتماعیات اور ماہرینِ نفسیات سے پوچھتا ہے "تم ہمیں ایک صالح معاشرہ کب تک ہم پہنچا سکو گے؟ کیا ہمیں تباہی

بچانے کا انتظام بروقت ہو جائے گا۔ پھر جب وہ اُسے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتے تو وہ مجھ ایسے تاریخ دانوں سے سوال کرتا ہے "جس اُلجھن میں انسانیت آج گرفتار ہے، اس کے پیشِ نظر تاریخ کا انجام کیا ہوگا؟"

"فنی کمالات بجائے خود حکمت یا بقا کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ تمدن جب کبھی خود اپنی صنعتی اور مشینی مہارت کے دلدادہ ہوئے تو اس وقت اُن کا قدم ناگزیر طور پر خودکشی کی طرف اٹھا۔ بعید نہیں کہ تمدن اس قسم کے رجحان کا رُخ بدل لیں اور از سرِ نو پنپ سکیں۔ مگر یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ "آلات" پر بحیثیتِ مقصدِ زندگی توجہ کرنا ترک کر دیں۔ یہ چیز جتنی اس زمانے میں درست ہے، اتنی ہی ماضی میں صحیح تھی۔"

"پوری تاریخ سے مجھے ایک ہی سبق ملتا ہے" یہاں کوئی چیز دنیاوی کامیابی سے بڑھ کر ناکام نہیں"۔ اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرا اس بات پر پختہ یقین ہو گیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برسرِ عمل رہتی ہے اور وہ اپنے جغرافیائی ماحول، نقل مکانی یا داخلی تغیرات کے پیدا کردہ ہر چیلنج کا جدید اور تخلیقی طریقوں سے بخوبی جواب دے سکیں۔

"آج مشین پر قدرت نے ہمیں سخت خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اپنی صنعتی ترقی سے ہم اس قدر مسحور ہیں کہ ہم ان وسیع تر تخلیقی اقدامات کو بھی، جو ہمارے بقا کے لیے اشد ضروری ہیں، بھول گئے ہیں۔ پرستش انسان کا ایک نہایت ہی طاقتور فطری داعیہ ہے۔ ہمارے عہد کے پرفتن ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمیں اپنی قوم، اپنے جھنڈے، اور اپنی تاریخ ماضی کو پوجنے کی تربیت دی گئی ہے۔ آدمی کا صرف ایک خدا کی پرستش کرنا ہی اس کے لیے صحیح ہے۔ یہ پہلا حکم ربانی درحقیقت افراد اور معاشروں کی نشوونما کے لیے بھی اولین قانون ہے۔ جب ہم اسے توڑ کر اپنے ماضی کے بت کی پرستش شروع کر دیتے ہیں تو ہم ناکام و نامراد ہو جاتے ہیں۔"

"ہماری جدید سائنٹفک ترقیات صنعتی دور کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب تھیں۔ اور ایک نہایت ہی عمدہ جواب! لیکن جو مسائل ہمیں درپیش ہیں، وہ اس نوعیت کے نہیں ہیں کہ ان کا

جائے تجربہ گاہوں سے دیا جائے۔ یہ اخلاقی مسائل ہیں اور سائنس اخلاق کے دائرے میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔

" اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی ہماری حالیہ مساعی بداہتہً ناکام ہو چکی ہیں اور ہمارے تمام بلند بانگ منصوبے محض مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج بالکل کھل کر ہمارے سامنے آچکے ہیں . . . . ہم نے مشین کو یکسر آزاد کر کے دیکھ لیا ہے اور یہ بات اب واضح ہے کہ انسان کے لیے اخلاقی اقدامات جتنے آج ضروری ہیں گذشتہ زمانوں میں بھی تھے۔ بلکہ اس سے زیادہ فیصلہ کن حد تک ضروری ہیں۔

" جن ۲۱ تمدنوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے، ان کو ملیٹ کر دیکھتے ہوئے انسان کی ذہانت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ محض دنیا کو اپنا منتہائے مقصود قرار دینے کے بعد پھر کوئی خوشگوار اخلاقی فیصلہ کر سکے گی۔ ہاں! نوع انسانی کی محبت ایک تاریخی طاقت ہے لیکن وہ بھی صرف اسی حالت میں جبکہ وہ فطری نتیجہ ہو خداوند تعالیٰ سے گہری وابستگی کا! پس دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیاء ہے۔ اس کے بغیر اُس انسان پر، جس کے ہاتھ میں اپنے عمل سے تیار کیے ہوئے خطرناک کھلونے ہیں، کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا "

یہ اقتباس ذرا طویل ہو گیا ہے مگر اس کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ قدرے تفصیل کے ساتھ یورپ کے فکری رجحانات کا مطالعہ کر سکیں۔ یہ رائے کسی "متعصب ملا" کی نہیں بلکہ اُس محقق کی ہے جس کی فکری برتری کے اپنے اور پرائے سب معترف ہیں۔

اسی سلسلہ میں دوسرا شخص جس کو بطورِ شہادت کے ہم پیش کرتے ہیں وہ پی اے سارو کن (P. A. SOROKIM) ہے۔ اس نے اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء میں ایک کتاب "ہمارے عہد کا بحران" (THE CRISIS OF OUR AGE) تصنیف کی۔ یہ صاحب ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات کے صدر ہیں۔ اس سے پہلے وہ عمرانیات کے بین الاقوامی ادارہ کے صدر رہ چکے ہیں۔

صاحب موصوف نے اپنی تصنیف میں نہایت ہی ٹھوس اور واضح دلائل کے ساتھ یہ ثابت

کیا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن پر اب نزع کا عالم طاری ہے، اور یہ مصیبت جس میں کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت گرفتار پاتا ہے۔ آفتِ ناگہانی نہیں بلکہ یہ ایک فطری نتیجہ ہے اُس فکر کا جسے یورپ نے پچھلے دو سو سال میں جنم دیا ہے۔ اس عالمگیر فساد کا ذکر جن الفاظ میں اُس نے کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ اُن پر نہایت ہی ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔

وہ لکھتا ہے :-

"بدیہی شہادتوں کے پیشِ نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ، ہماری تنظیم، ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گذر رہے ہیں۔ جسم کا کوئی حصّہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے سارے بدن میں ناسور ہیں۔ ہم اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جس کے ایک طرف ماضی کا حسّی تمدن (SENSATE CULTURE) ہے اور دوسری طرف مستقبل کا تصوّری تمدن IDEATIONAL (CULTURE)۔ ہم چھ سو سال گزارنے کے بعد اب زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی بھولی بھٹکی کرنیں اگرچہ دنیا کو منور کر رہی ہیں مگر رات کے تاریک سائے بھی ہر لمحہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس شفق میں جبکہ سورج کی بصارت میں کمی واقع ہو گئی ہے، ہمارے لیے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ تاریک رات نوعِ انسانی کو اپنے ڈراؤنے پردوں میں چھپانے کے لیے منتظر ہے . . . . مگر اس تاریکی سے بہت دُور تصوری تمدن کی صبح بھی مستقبل کے انتظار میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔"

فاضل مصنف نے نہایت ہی دیدہ وری کے ساتھ اپنے زمانہ کی خرابیوں اور خامیوں کا احساس کیا ہے۔ اس کی وطن پرستی اندھی نہیں، روشن ضمیر ہے۔ وہ دورِ حاضر کی فنی اور صنعتی ترقی اور سائنس کے کمالات سے خیرہ چشم ہو کر کسی خوش فہمی میں گرفتار نہیں ہوا بلکہ اُس نے اپنی قوتِ تنقید کو بیدار رکھا ہے اور ایکس رے ایکسپرٹ کی طرح فساد کے ان مرکزوں کی نشاندہی کی ہے جو اگرچہ دنیا کی نظروں سے مستور ہیں مگر نوعِ انسانی کے جسم کو بیمار اور اُس کے خون کو گندا کر رہے ہیں۔ اُس کے نزدیک یہ فساد ہمہ گیر ہے اور

زندگی کے رگ و پے میں پورے طور پر سرایت کر چکا ہے۔ لہٰذا دورِ جدید کا سب سے اہم مسئلہ یہ نہیں کہ نظامِ حیات کا ظاہری ڈھانچہ کس شکل کا ہونا چاہیے بلکہ سب سے ضروری سوال یہ ہے کہ فساد کی ان جڑوں کو تبدیل کیا جائے جن سے شر اور فساد کی یہ ساری کونپلیں پھوٹتی اور غذا حاصل کرتی ہیں چنانچہ پروفیسر سارو کن پورے زور سے کہتا ہے:۔

"دورِ حاضر کے بحران کی وجہ یہ نہیں کہ اس عہد میں ہٹلر یا مسولینی، سٹالن یا چرچل نے جنم لیا۔ یہ لوگ تو اس بحران کی پیداوار ہیں۔ ان کو دنیا کے سٹیج سے ہٹا دینے سے فساد کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ اُن کے ہٹنے کے ساتھ ہی ان سے زیادہ شریر لوگ ان کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ اگر ہم واقعی اصلاحِ حال چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے فکر و نظر کے زاویوں کو بدلنا چاہیے۔ یہ تبدیلی اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ لوگوں میں اپنی تباہی و بربادی کا ایک شدید احساس پیدا ہو کیونکہ یہ احساس ہی لوگوں کو انقلاب کے لیے سرگرمِ عمل کر سکتا ہے"۔

اس کے علاوہ کتاب کا مصنف لوگوں کی اس غلط فہمی کو بھی دُور کرتا ہے جس میں گرفتار ہو کر وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس حسّی تمدن کے علاوہ کوئی دوسری جامع تہذیب نہیں جو انسانیت کو آرام اور سکون بہم پہنچا سکے۔ اُس نے پوری وضاحت سے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس تہذیبِ الحاد کے مقابلہ میں ایک ایسا نظامِ حیات بھی ہے جس کی بنیاد خدا پرستی پر رکھی گئی ہے یورپ میں یہ فکری رجحان صرف فلاسفہ تک ہی محدود نہیں بلکہ عہدِ حاضر کے بیشتر شاعر، افسانہ نگار اور ادیب ایسے ہیں جن کی نگارشات میں یہ چیز پوری طرح نمایاں ہے۔ اور تو اور خود سیاست دان اس نازک صورتِ حالات سے سخت پریشان ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر جنگ کے فاتح مسٹر لائڈ جارج نے نہایت ہی اضطراب کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہماری ساری ترقی، ترقیِ معکوس ہے اور انسانیت کو سائنس کی قوت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہُوا بلکہ اس نے انسانیت کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ چنانچہ اُس نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا:۔

"اگر حضرت مسیح اس دنیا میں تشریف لے آئیں تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے۔ وہ ملاحظہ

یہ فرمائیں گے کہ دو ہزار برس کے بعد بھی انسان فتنہ و فساد، کشت و خون، قتل و غارت میں بدستور مبتلا ہے، بلکہ اس وقت تو انسانیت کے جسم سے تاریخ کی عظیم ترین جنگ کے اثر سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں، اور زمین اس قدر تاراج ہو چکی ہے کہ نوبت فاقہ کشی کی آ گئی ہے اور حضرت آ کر کیا دیکھیں گے؟ کیا اخوت و مساوات کے ساتھ لوگوں کو ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے دیکھیں گے یا اس کے بالکل برعکس اس جنگِ عظیم سے بڑھ کر مہلک و پُر اذیت جنگ کی تیاریاں کرتے۔ ایک سے ایک بڑھ کر جان لیوا اور ستم کیش آلاتِ ہلاکت ایجاد کرتے اور تعذیب کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے دیکھیں گے!"

تہذیبِ الحاد کے بارے میں جو چند آراء اوپر پیش کی گئی ہیں، وہ میں مغربی ادب کی سلوٹوں سے ڈھونڈ کر نہیں لایا بلکہ یہ وہ عام رجحان ہے جو یورپ میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ آپ کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھیں اُس میں اسی کا تذکرہ پائیں گے، کسی رسالہ کے اوراق اُلٹیے اُس میں یہی جھلک جھلکتا ہوا نظر آئے گا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اس تمدن کی نامرادی کو پوری طرح وہی لوگ محسوس کر رہے ہیں جو حساس دل رکھتے ہیں، جن میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہے۔ جو زندگی اور اُس کے مسائل کو محض خود فریبی سے ذرا ہٹ کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ جن کے کان جنگی فتوحات کے شادیانوں کے علاوہ غریبوں اور مظلوموں کی آہ و فغاں سننے کے لیے بھی تیار رہ جاتے ہیں۔ باقی رہے عوام تو اُن کو اس تہذیب نے خود فراموشی کے جام پلا پلا کر اتنا بدمست کر دیا ہے کہ انہیں "عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ وہ حسیات اور اس کے لذائذ میں اس قدر گم ہو گئے ہیں کہ اس سے ماوراء انہیں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مگر ان کے چہروں پر غم و یاس کے نشانات اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ کوئی اُن کے چہروں کی رونق کو لوٹ کر لے گیا ہے، کسی نے انہیں اتنا پاگل بنا دیا ہے کہ وہ خود ہی اپنا گوشت مزے سے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، مگر اپنے دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی دوسرے بدن سے حاصل کیا گیا ہے۔ وہ خود اپنا خون پینے میں گوناگوں لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ عام تاثر اس شخص کا جس نے

کبھی بھی زندگی کی گہرائیوں میں اُتر کر اُس کا مشاہدہ کیا ہو۔ وہ نہایت آسانی سے اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ مغرب میں انسانیت مادّی وسائل کی فراوانی کے باوجود سخت پریشان ہے۔ سائنس سے جو توقعات اُس نے صدیوں سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہو سکیں۔ یورپ کا ہر فرد اگرچہ اپنے اس اضطراب کا کوئی سائنٹفک تجزیہ کر کے اس کا علاج تو تجویز نہیں کر سکتا مگر اُس کا دل ایک تڑپ محسوس کرتا ہے اور اُس کے لبِ مرگ زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں ؏

جگر کی آگ بجھے جس سے وہ شئے لا

یہ سخت بے انصافی ہوگی اگر ہم تہذیبِ مغرب کو سرتا پا باطل قرار دے لیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس میں حق، خیر اور افادیت کا سرے سے کوئی عنصر بھی شامل نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں خالص باطل، شر اور مضرت کا ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ رہنا محال ہے۔ دنیا میں جب کبھی سلبی اقدار پروان چڑھتی ہیں تو وہ اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے جلو میں چند ایجابی قدروں کو لے کر چلیں جن کے بغیر اُن کا قافلہ ایک قدم بھی بڑھ نہیں سکتا۔ دنیا میں خالص باطل کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، مگر اسے عملی زندگی میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی حال اس تہذیبِ مادیت کا ہے۔ اس کی عمارت یقیناً غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس میں بلاشبہ بہت سے پہلو مضرت اور شر کے ہیں، جنہوں نے انسانیت کی روح کو سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کئی جوہر ایسے بھی ہیں جن کی کشش نے لوگوں کو اس کی طرف کھینچا اور وہ اسے اس دنیا میں نافذ کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوئے۔

جدید یورپ اور اس کے تاریخی پس منظر پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس تمدن نے انسانیت کی بعض پہلوؤں سے بڑی ہی خدمت کی۔ انسانی عقل کو ایک زوال پذیر مذہب کے بے حس بندھنوں سے نجات دلائی۔ اُسے سوچنے اور سمجھنے پر اُبھارا۔ لوگوں کے دلوں میں اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کے جذبہ کو موجزن کیا اور کلاسیکی سکونِ آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو انسانی زندگی کا رہبر بنا دیا۔ قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے پوری یورپی زندگی

متاثر ہوئی۔ مغربی مفکرین نے تحقیق کے نئے نئے طریقوں کی ایجاد کی، انہوں نے بے جان نظامِ تصورات کو چھوڑ کر حقائقِ اشیاء کی کنہ تک پہنچنے، اور اُن پر تصرف کرنے کا عزم کیا۔ اسی کی بدولت بڑے بڑے انکشافات اور ایجادیں ہوئیں جن سے مغربی دنیا میں زبردست ذہنی اور مادی انقلاب پیدا ہوتا۔

مگر عقل کا سیلاب جب ہر قسم کے بند توڑ کر بہہ نکلا تو اس سے اہلِ یورپ کو شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ دنیا میں آج کل جس قدر فکری اور عملی بے راہ روی پائی جاتی ہے، وہ سب عقل کی اسی آزادی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ عقل پرستوں کی سب سے پہلی جنگ اہلِ مذہب کے خلاف تھی، اس لیے عقل نے مذہب کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے ہوئے یہ فرض کر لیا کہ وہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ مذہب کو دنیا سے یکسر مٹا نہ دے۔ وہ اگر ذرا غور و فکر کرتی تو اُسے یہ بات معلوم ہو جاتی کہ اُس کا اصل دشمن مذہب نہیں بلکہ ایک مخصوص گروہ کا خاص طرزِ استدلال ہے یہ وہ غلط نقطۂ آغاز تھا جہاں سے "اہلِ خرد" نے اپنا سفر شروع کیا اور اس غلط راستہ پر ایک دفعہ پڑ نے کی وجہ سے اُن کے جتنے قدم بھی اُٹھے وہ گمراہی کی طرف ہی اُٹھے اور دو صدیاں گذر جانے کے بعد بھی وہ صحیح سمت دریافت نہ کر سکے۔

عقل و مذہب کی اس باہمی آویزش کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی عقل قوانینِ اخلاق کی محکومی سے آزاد ہو گئی۔ جب مذہب کے بنیادی عقائد ساقط الاعتبار قرار دیئے گئے تو اس کے اخلاقی ضوابط کا اثر بھی آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا۔ اخلاق و مذہب سے بُعد و تنفّر جو تاریخی حالات کا پروردہ تھا مغربی ذہن کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے اثرات اس کے ہر شعبۂ تمدن میں نمایاں اور کارفرما ہیں۔ اگرچہ مغربی مفکرین میں سے بعض ہمیشہ اس امر کے دعویدار رہے کہ وہ مذہب اور اُس کے قوانین سے کوئی بغض اور عناد نہیں رکھتے اور وہ صرف طبعی علوم تک "آزادیٔ افکار" کے حامی ہیں، مگر عملی حیثیت سے ایسا نہیں ہے، عقلی بغاوت کے اثرات صرف طبعی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا اثر ان علوم پر بھی پڑا جو اجتماعی زندگی اور انسانی معاشرت و تمدن سے براہِ راست متعلق ہیں۔

عقل نے بدقسمتی سے آغاز میں ہی یہ فرض کر لیا کہ وہ زندگی کے ہر گوشہ کے متعلق نہایت کامیاب طریق سے آئین و ضوابط پیش کر سکے گی، مگر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اُس کے اس بلند دعویٰ میں ہی اُس کی نامرادی کا راز مضمر ہے۔ انسانی اعمال کے محرکات اور ان کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ انہیں علمِ کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اُسی وقت قائم ہوتی ہے جب کہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں سائنس کی بے لوثی کبھی نہیں آسکتی۔

پھر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ عقل اپنا طبعی فریضہ انجام دینے میں تنہا کافی نہیں، وہ اس بات پر مجبور ہے کہ کام کرتے وقت اپنے سے کمتر چیزوں سے مدد لے۔ یہ سہارے خواہ اُسے کتنے ہی ناپسند ہوں مگر اُس کے لیے بہرحال ضروری ہیں اور ان کے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ کھڑی بھی نہیں رہ سکتی تو یہ زیادہ صحیح ہو گا۔ کسی ایسی چیز تک پہنچنے میں جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی، اُسے اُن معلومات پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، جو اس کو پہلے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں۔ تمام معقولات کی تحلیل اور تجزیہ کیجیے، اور عقل کی دلچسپ اور حیرت انگیز مہمات کی داستان سنیے تو معلوم ہو گا کہ حقائق کی ان نئی نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لاعلمی کے ان بڑے بڑے سمندروں کے عبور کرنے میں اس کا ذریعۂ سفر وہی حقیر محسوسات تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ محسوسات ہمیں کہاں سے حاصل ہوتے ہیں، کیا وہ کوئی ریاضی کے تجریدی اصول ہیں، یا وہ اُن تجربات سے عبارت ہیں جو ہمیں ہر صبح اور ہر شام اس آب و گل کی دنیا میں میسّر آتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ تجربات سے مراد ہمارا اسی مادی دنیا میں روزمرہ کا ردِ عمل ہے۔

وہ انسان جو کسی بلند و بالا ہستی پر ایمان نہیں رکھتا، اور یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لیے ہدایت کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ اور مجرد عقل کی مدد سے اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی کے لیے اصول وضع کرتا ہے وہ یقیناً اپنے شخصی تجربات سے کام لیگا۔ ان تجربات میں اُس کے

فطری میلانات اور خاندانی وقومی روایات کا جس قدر دخل ہوتا ہے اُس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ وہ عقل جسے اپنی صحت، اپنی غیر جانبداری اور بے تعصبی پر اس قدر ناز تھا وہ عمل کے اعتبار سے انسان کے رجحانات اور اجتماعی ذوق کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بن کے رہ جاتی ہے۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ انسان کے ذاتی رجحانات اور جماعتی ذوق کی تعمیر جن بنیادوں پہ کی جاتی ہے وہ صرف مادی اور محسوس فوائد یا عارضی اور فوری منافع کا حصول ہے۔ کیونکہ یہی وہ واحد معیار ہے جس پر انسانی عقل تجربہ کی مدد سے اپنی کامیابی کو جانچ سکتی ہے۔ اسی وجہ سے انسان کے لیے جو ضابطۂ اخلاق مرتب ہوا وہ یہ ہے کہ جن افعال سے اُسے انفرادی یا اجتماعی مسرت حاصل ہو، یا دوسرے الفاظ میں مادی لذائذ میں اضافہ ہو وہ خیر ہیں اور جن سے اُن میں کمی واقع ہوتی ہو، وہ شر ہیں۔

اس نظریۂ زندگی نے نہ صرف غرض پسندی کو وجہ جواز عطا کی، بلکہ اخلاقی زندگی کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ نظام اخلاق سارے کا سارا اس مدار پر قائم ہے کہ انسان مادی نفع ونقصان کے خیال سے یکسر بے پروا ہو کر اخلاقی اصولوں کی پابندی محض اس بنا پر کرے کہ وہ ان کی صداقت پر یقین رکھتا ہے۔ لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ انسان کی حسی خواہشات اور اُن کی تکمیل ہی مدارِ زیست ہے، اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے جو طریق بھی اختیار کر لیا جائے وہی عین حق اور صداقت ہے، تو اس سے لازمی طور پر سوسائٹی کا استحکام ختم ہو گا، اور ایک سیمابی کیفیت پیدا ہو گی۔ مغربی اقوام میں گذشتہ سو سال سے باہمی پیکار و تصادم کا جو بازار گرم ہے وہ اسی خالص غرض پرستی کا نتیجہ ہے۔

پھر اس فلسفۂ حیات نے انسانی فلاح کا بھی بالکل ایک نیا طریقہ رائج کیا۔ مغربی تہذیب سے پیشتر جب مذہب کی کچھ اقدار باقی تھیں، اور انسان کسی نہ کسی طور پر ان کے زیر اثر تھا تو وہ تمدنی یا معاشرتی بہبود کے لیے انسان کے نفسی اور باطنی محرکات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر جب سے نیا انسان حسیات پر ایمان لایا ہے اُس کے طرزِ اصلاح میں یکسر تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ تو اب یہ سمجھنے لگا ہے کہ صرف خارج میں کچھ تغیرات پیدا کر لینے کے بعد انسان کی پوری زندگی تبدیل کی جا سکتی ہے۔ یہ

صحیح ہے کہ خارجی نظامات مثلاً نظامِ حکومت یا نظامِ معیشت انسانی کردار و افعال پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات پیدا کرتے ہیں لیکن جب تک انسانی ضمیر اور انسان کے باطنی محرکات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو خارجی احوال کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ اصل اور حقیقی انقلاب اسی وقت رونما ہوتا ہے جب زندگی کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر بدل جائے۔

پچھلے صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ دراصل نہایت ہی مختصر الفاظ میں نقشہ ہے اس فلسفۂ زندگی کا جس پر یورپی تہذیب کی عمارت اُٹھائی گئی ہے۔ اب ہم چند مثالوں کے ذریعے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ کس طرح یہ نظریۂ حیات مختلف تحریکات کی صورت میں جلوہ گر ہوا، اور وہ کیونکر انسانیت کو حقیقی فلاح سے ہمکنار کرنے میں ناکام رہا۔

انسانی تمدن کا ہمیشہ سے یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ رہا ہے کہ فرد اور جماعت کے تعلق کی نوعیت کیا ہو۔ آیا فرد جماعت میں اپنی انفرادیت ضم کر دے یا وہ جماعت کو اپنے استحکام اور بقا کے لیے استعمال کرے۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب بھاپ کے دیو کو مسخر کر لینے کی وجہ سے انسان کے ہاتھ میں بے پناہ قوت آ گئی، تو اب اس کے سامنے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اس قوت اور طاقت کو کس طرح استعمال میں لایا جائے۔ بدقسمتی سے یہی وہ زمانہ تھا جب اہلِ مغرب مذہب کو بالکل پس پشت ڈال چکے تھے اور اس کا کوئی معمولی سے معمولی اثر اُن کے دل یا دماغ پر موجود نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس قوت اور طاقت سے صرف اپنے استحکام کے لیے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی اور وجود کا مقصد صرف یہی سمجھا کہ وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد سمیٹیں، خواہ اُن کے اس عمل سے دوسرے انسان کو کتنا عظیم نقصان برداشت کرنا پڑے۔ اسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے جاذبِ نظر اور دلکش فلسفے گھڑے گئے۔ نظامِ حکومت، نظامِ معیشت اور نظامِ معاشرت اسی کے مطابق ڈھالے گئے۔ سرمایہ داری نظام اس نظریۂ حیات کا مظہر اتم ہے۔

یہ فلسفۂ حیات اتنا کمزور اور یک رُخا ہے کہ اس پر کسی اجتماعی زندگی کی مستقل طور پر تعمیر نہیں کی جا سکتی

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چند سالوں ہی میں ایک خاص طبقے نے پوری کی پوری قوم کو قلاش اور مفلس بنا کر رکھ دیا۔ عوام کی محنت، ذہانت و طباعی کو ایسے کاموں پر لگا یا گیا جن سے اس گروہ کو فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ قوم کی ساری صلاحیتیں اور قوتیں صرف اسی کی چاکری میں صرف ہونے لگیں۔

اس نظریۂ حیات پر ایمان رکھنے والے انسانوں کے اندر اگر وسعت نظر بھی پیدا ہوئی تو وہ اپنے قومی اور ملکی حدود کو پھاند نہ سکی۔ قوم کے نچلے اور کمزور طبقوں کو نہایت عیاری سے یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ وطن کی عزت و حرمت اور اس کی بڑائی ہی اعلیٰ ترین اخلاقی قدر ہے۔ اُن کی زندگی کی غایتِ اولیٰ یہ ہونی چاہیے کہ وہ اخلاق کے پورے نظام کو اس قدرِ اعلیٰ کا محکوم و تابع بنا دیں۔ خاکِ وطن کے سامنے سربسجود ہوں اور اسی "ربِ عظیم" کے حضور میں ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی پیش کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر لحظہ تیار رکھیں۔ قومی لیڈر خواہ اپنی انفرادی زندگی میں کیسے ہی بدکردار اور دوسری قوموں کے لیے کتنے ہی ظالم اور سفاک ہوں اس دین کے ائمہ و صلحا ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس تصورِ حیات کے ساتھ کوئی پائیدار اور اخلاقی نظام کبھی میل نہیں کھا سکتا۔ درحقیقت قوم پرستی کا وجود ہی قانون اور اخلاق کی نفی ہے۔ یہاں اپنی قوم کے مفاد کی خاطر دوسری اقوام کے مفاد کو قربان کرنا، قومی منافع کے حصول کی غرض سے اوروں کو تباہ و برباد کرنا، اور پھر اپنے کیے پر بجائے اظہارِ ندامت کرنے کے، گونا گوں لذت اور راحت محسوس کرنا، یہ سب خصوصیات قوم پرستی کی اولیں بنیادیں ہیں۔ اسی سے فریب، مکر و زور اور دیگر اخلاقی معائب جنہیں خود ایک قوم کے افراد باہمی معاملات میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، قومی اور ملکی مفاد کی حمایت اور دوسری اقوام کے مقابلہ میں جائز ٹھہرائے جاتے ہیں۔ پچھلے دو سو سال میں انسانیت کو جو جو اذیتیں پہنچی ہیں اُن میں زیادہ دخل اسی تصور کا ہے۔

(باقی)